مقالات

دعوت کے طریقے

از جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

بعض دینی حلقوں میں خدا جانے یہ خیال کہاں سے پھیل گیا ہے کہ تبلیغ کا معیاری اور اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ آدمی ہاتھ میں ایک لٹھیا اور جھولی میں تھوڑے سے چنے لے اور تبلیغ کے لیے نکل کھڑا ہو۔ نہ پاؤں میں جوتی ہو نہ سر پہ ٹوپی، گاؤں گاؤں پھرے اور جس جگہ کوئی شخص مل جائے، خواہ وہ سنے یا نہ سنے، اس پر تبلیغ شروع کر دے۔ اگر کسی شہر میں گذر ہو تو وہاں جس نکڑ یا چوراہے پر چار آدمی نظر آجائیں وہیں تقریر کے لیے کھڑا ہو جائے۔ ریل میں، اسٹیشن پر، بازار میں، سڑک پر جس جگہ کوئی بھیڑ مل جائے وہیں اس کا وعظ شروع ہو جائے۔ ہر مجلس میں گھس جائے، ہر کانفرنس میں اپنی جگہ پیدا کرے، ہر پلیٹ فارم پر جا دھمکے۔ سننے والے تھک تھک جائیں لیکن وہ سنانے سے نہ تھکے، لوگ اس کے تعاقب سے گھبرا گھبرا جائیں لیکن وہ خدائی فوجدار بنا ہوا ہر ایک کے سر پر مسلط رہے، لوگ اس کے سوال و جواب کے ڈر سے چھپتے پھریں اور بسا اوقات آزردہ ہو کر گستاخیاں اور بدتمیزیاں بھی کر بیٹھیں لیکن وہ اسی جوش و انہماک کے ساتھ اپنا کام جاری رکھے۔ جہاں وعظ کی ضرورت ہو وعظ کہے، جہاں میلاد کی خواہش کی جائے میلاد پڑھ دے اور جہاں مخالفین و منکرین سے سابقہ پڑ جائے وہاں خم ٹھونک کے میدان مناظرہ میں بھی اتر پڑے۔ یہ ہے تبلیغ کا اصلی طریقہ اور یہ ہے ایک سچے مبلغ کی صحیح تصویر جو ہمارے بہت سے دیندار لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے۔ تبلیغ و تعلیم کے موجودہ ترقی یافتہ اور سائنٹفک طریقوں کے تھوڑے بہت مفید ہونے کے ممکن ہے یہ لوگ منکر نہ ہوں لیکن خیر و برکت والا طریقہ ان کے نزدیک یہی ہے جس کو ان کے خیال میں حضرات انبیاء نے اختیار فرمایا۔

ہمارے نزدیک اس طریقہ کو انبیاء کا طریقہ سمجھنا کچھ تو انبیاء کے طریقہ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے اور

کچھ ان حضرات کی اس خواہش کا کہ ان کا اپنا اختیار کیا ہوا طریقہ (جس کے سوا کسی اور طریقہ کو اختیار کرنے کی صلاحیت سے وہ محروم ہیں) ایک محترم ومقدس طریقہ ثابت ہو جائے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے آج کی صحبت میں ہم بتائیں گے کہ انبیائے کرام نے تبلیغ کے جو طریقے اختیار کیے ہیں وہ ان کے زمانوں کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ اور ترقی یافتہ طریقے تھے اور یہ طریقے حالات کے تغیر اور تمدنی ترقیوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس معاملہ میں کسی ایک ہی طریق پر اصرار صحیح نہیں ہے بلکہ داعیانِ حق کو چاہیے کہ وہ ہر زمانہ میں تبلیغ وتعلیم کے لیے وہ طریقے اختیار کریں جو ان کے زمانوں میں پیدا ہو چکے ہوں اور جن سے اپنی کوششوں اور قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز بنایا جا سکتا ہو۔

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ انبیائے کرام نے تبلیغ کے کام میں، جیسا کہ عرض کیا گیا، کسی ایک ہی طریقہ پر اصرار نہیں کیا ہے بلکہ جس رفتار سے دنیا میں علم وفن ترقی کرتا گیا ہے اسی اعتبار سے ان کی تبلیغ وتعلیم کے طریقے بھی بدلتے گئے ہیں۔ ابتدائی دور تمدن میں جب لکھنے پڑھنے کا فن وجود میں نہیں آیا تھا انبیاء کی تعلیم وتبلیغ بھی زبانی تھی۔ وہ نیکی اور سچائی کے کچھ اصول لوگوں کو زبانی آکر تلقین کر دیتے اور لوگ ان کو یاد کر لیتے جو نسلاً بعد نسلٍ روایات کی شکل میں ان کے ماننے والوں میں منتقل ہوتے رہتے۔ یہاں تک کہ جب امتدادِ زمانہ سے وہ اصول فراموش ہو جاتے یا ان کے اندر دوسری آمیزشیں ہو جاتیں تو اللہ تعالیٰ کسی اور نبی کو بھیجتا جو آکر اس تعلیم کو از سرِ نو تازہ کر دیتا۔ جب تک تحریر کا فن ایجاد نہیں ہوا تبلیغ کے معاملہ میں سارا اعتماد شخصی ارتباط، زبانی اظہار اور قوتِ حافظہ پر رہا لیکن جب انسان نے تحریر کا فن ایجاد کر لیا جس نے ایک حد تک انسان کو اِن چیزوں سے مستغنی کر دیا اور لوگوں تک کسی چیز کے پہنچانے اور ان کو ان کے اندر محفوظ رکھنے کا ایک اور ترقی یافتہ طریقہ پیدا ہو گیا تو انبیائے کرام نے اس کو بھی اختیار فرما لیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے زبانی تلقین کے بجائے تورات کے احکام اپنی قوم کو تختیوں پر لکھ کر دیے۔ اسی طرح عربوں کو دین کی تعلیم قلم کے ذریعہ سے دی گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اس بات کا احسان جتایا کہ ان کو صرف زبانی تعلیم کے بجائے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی گئی ہے جو تعلیم کا ایک اعلیٰ اور محفوظ ترین ذریعہ ہے

اِقْرَءْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ — اور تو پڑھ اور تیرا خداوند وہ فیاض خدا ہے جس نے قلم کے ذریعہ

بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (۳-۵ علق) نے تعلیم دی اور انسان وہ چیز سکھائی جس سے وہ نا آشنا تھا۔

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ انسان کو قلم کے استعمال کا اس نے ڈھنگ سکھایا اور پھر اس کے اس ترقی یافتہ طریقہ کو تعلیم دین کا ذریعہ بنایا جس کی وجہ سے وہ اس لائق ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ــــ کتاب ــــ کے پانے کا مستحق ہو۔ زبانی تعلیم کے مقابل میں قلم اور کتاب کی تعلیم کو جو ترجیح حاصل ہے اور اس میں اتمام حجت اور تبلیغ کامل کے جو پہلو ہیں ان کی طرف قرآن نے جگہ جگہ اشارات کیے ہیں لیکن یہ موقع اس کی تفصیل کا نہیں ہے۔ یہاں ہم جس بات کو سامنے لانا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ انبیاء کا طریقۂ تبلیغ کوئی جامد طریقہ نہیں ہے بلکہ انسان کی علمی و ذہنی ترقیوں کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی اور ترقی ہوتی رہی ہے جس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ سائنس اور تمدن کی ترقی سے انسان کے وسائل کار اور ذرائع معلومات میں جو اضافے ہوئے ہیں ان سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا حق داعیان حق کو ہے۔ مثلاً آج پریس اور ریڈیو وغیرہ نے انسان کی قوت ابلاغ کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ ایک بڑی سے بڑی تقریر چند منٹوں کے اندر دنیا کے ایک گوشہ سے لے کر دوسرے گوشہ تک پہنچائی جاسکتی ہے، کسی وسیع سے وسیع تحریک سے چند دنوں کے اندر اندر دنیا کے تمام پڑھے لکھے انسانوں کو آشنا کیا جاسکتا ہے، مشکل سے مشکل باتیں بہت معمولی محنت سے عوام اور خواص سب کے ذہن نشین کی جاسکتی ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ آج حق کی تبلیغ کے لیے ان ذرائع پر قبضہ کیا جائے۔ اگر اہل حق یہ خیال کرکے ان چیزوں کو نظر انداز کردیں کہ انبیاء نے تبلیغ دین کے کام میں ان چیزوں کو استعمال نہیں کیا ہے بلکہ دروازہ دروازہ پہنچکر ایک ایک شخص پر تبلیغ کی ہے اس وجہ سے ہمارے لیے بھی اولیٰ یہی ہے کہ ہم ان چیزوں کو ہاتھ نہ لگائیں بلکہ گھر گھر پہنچکر لوگوں کو تبلیغ کریں تو یہ انبیاء کے طریقہ کی پیروی نہیں ہے بلکہ شیطان کا ایک بہت بڑا دھوکا ہے جو وہ اس لیے دے رہا ہے تاکہ جب تک آپ اپنے "دیندارانہ" طریقہ پر عمل کرکے دو آدمیوں سے کوئی بات کہیں ــ اس وقت تک وہ ان سائنٹفک وسائل سے کام لے کر ہزاروں لاکھوں نہیں بلکہ کروروں انسانوں تک اپنی دعوت باطل نہایت موثر طریقہ پر پہنچا دے۔ شیطان نے یہی دھوکہ دے کر اکثر اہل حق کی کوششوں اور قابلیتوں کو نقصان پہنچا دیا ہے اور ان کے

مقابل میں خود اپنا پلہ بھاری رکھا ہے یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اب زندگی کے ہر میدان میں یہ پیچھے ہیں اور وہ آگے ہے اور دونوں کی کوششوں کے نتائج میں سرے سے کوئی نسبت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے اور یہی صورت حال اس وقت تک باقی رہے گی جب تک اہل حق ان زبردست قوتوں کو حق کی خدمت میں استعمال کرنے کا ڈھنگ نہ سیکھ جائیں جو آج سو فی فیصدی شیطان کے تصرف میں ہونے کی وجہ سے باطل کی خدمت میں صرف ہو رہی ہیں۔

۲۔ دعوت کا طریقہ جس طرح سائنٹفک نقطۂ نظر سے بہت اعلیٰ اور ترقی یافتہ ہونا چاہیے تاکہ باطل سے پوری قوت کے ساتھ مقابلہ ہو سکے اسی طرح معاشرتی اور اجتماعی پہلو سے زندگی میں جو ترقیاں ہو چکی ہیں ان سے بھی اس کام میں پورا فائدہ اٹھانا چاہیے تاکہ دعوت وقت کے معیار کے لحاظ سے باوقار ہو۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ سوسائٹی کے اندر آپس میں مل بیٹھنے، تبادلۂ خیالات کرنے، اپنے خیالات کو سنانے اور دوسروں کے خیالات کو سننے، کسی امر کو اجتماعی طور پر طے کرنے کے جو طریقے رواج پا چکے ہوں، اگر ان میں کوئی اخلاقی و شرعی قباحت نہ ہو، تو اہل حق ان کو اپنائیں اور تبلیغ حق میں ان سے کام لیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے کام میں ان تمام طریقوں سے فائدہ اٹھایا جو اس عہد کی معاشرت اور اجتماعی زندگی میں ترقی پا چکے تھے اور دعوت کے نقطۂ نظر سے کارآمد تھے۔ اول اول جب آپ نے اپنے خاندان کے اکابر کو ——— جو درحقیقت وقت کے بھی اکابر تھے ——— اپنے مقصد سے آگاہ کرنا چاہا تو آپ کے لیے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ دعوت کا سامان کرو اور تمام خاندانِ مطلب کو کھانے پر بلاؤ۔ حضرت علی نے اس حکم کی تعمیل کی۔ پورا خاندان مطلب جمع ہوا۔ حضرت حمزہ، ابو طالب اور عباس سب لوگ شریک ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے بعد کھڑے ہو کر ایک تقریر فرمائی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں ایک ایسی چیز لے کر آیا ہوں جو دین و دنیا دونوں کی سعادت کی کفیل ہے پھر آخر میں حاضرین سے سوال فرمایا کہ "اس بارگراں کو اٹھانے میں آپ میں سے کون میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے؟" اس سوال پر سب لوگ خاموش رہے۔ تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد حضرت علیؓ نے ایک گوشہ سے اٹھ کر نہایت موثر الفاظ میں فرمایا کہ "گو مجھ کو آشوب چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں اور گو میں سب سے نوعمر ہوں تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا۔

اس طریقہ کے علاوہ آنحضرت صلعم نے دوسرے عام طریقے بھی اختیار فرمائے مثلاً مکہ اور طائف کے سرداروں سے ملنے اور ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنے کے لیے خود تشریف لے جاتے ۔ حج کے زمانے میں جو قبیلے مکہ کے آس پاس آکے ٹھہر جاتے آپ ان کے سرداروں سے ملتے اور ان کو دعوت اسلام دیتے۔ بعض مقامات پر یا بعض خاص خاص لوگوں کے پاس اپنے نمائندے بھی بھیجتے ۔عرب میں کچھ موسمی بازار لگتے تھے جن میں ہر طبقہ کے لوگ جمع ہو جاتے تھے، آپ ان بازاروں میں بھی تشریف لے جاتے اور لوگوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنے کے موقعے پیدا کرتے ۔ بہت سے لوگوں کو آپ نے خطوط کے ذریعے بھی دعوت دی ۔غرض اس زمانہ میں لوگوں کو کسی چیز سے قریب کرنے یا لوگوں سے قریب ہونے کے جو طریقے پیدا ہو چکے تھے، اگر ان میں کوئی اخلاقی خرابی نہیں تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے کام میں ان سے فائدہ اٹھایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر عہد میں لوگ انہی طریقوں سے مانوس ہوتے ہیں جو اس عہد کی تمدنی و اجتماعی زندگی میں رواج پا چکتے ہیں اس وجہ سے ضروری ہوتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں انہی طریقوں کو اختیار کیا جائے جو ان کے طبائع اور حالات کے مناسب ہیں ۔جس طرح لوگ ملتے ہیں اسی طرح ان سے ملا جائے، جس طرح لوگ کسی بات کو سنتے ہیں اسی طرح ان کو سنانے کی کوشش کی جائے، جس طریق کار کو لوگ باوقار سمجھتے ہیں اسی طریق کار کو اختیار کیا جائے ۔ اگر ایک داعی ـــ بالخصوص ایک داعی حق ـــ ان طریقوں کے اختیار کرنے سے اس وجہ سے گریز کرے کہ یہ طریقے اس کے اپنے مذاق کے خلاف ہیں، یا وہ ان کو اختیار کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، یا ان طریقوں پر قدامت کی مہر نہیں لگی ہوئی ہے، اس وجہ سے اس کے نزدیک وہ معیاری نہیں ہیں، تو ان باتوں کا لازمی نتیجہ اس کی دعوت کی ناکامی ہے اور اس کی مخلصانہ کوششوں کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار بھی اس کی دعوت کو اس انجام سے نہ بچا سکے گی۔

اگر ایک شخص آج دعوت دین کے لیے یورپ کے کسی ملک میں جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں سے اپنا ربط بڑھانے اور ان کے اندر اپنے خیالات پھیلانے کے وہی ذرائع اور وہی طریقے اختیار کرے جو وہاں کی اجتماعی اور تمدنی زندگی میں رواج پا چکے ہیں ۔اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا یا نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس بات پر مصر ہے کہ وہ سڑکوں پر چل پھر کر ہی لوگوں کو کلمہ اور نماز سکھائے گا تو خواہ یہ شخص کتنا ہی مخلص ہو

لیکن وہ اپنے اس بے ڈھنگے پن سے اپنی محنت بھی رائگاں کرے گا اور کلمہ اور نماز کی عزت بھی خاک میں ملائے گا اس سلسلہ میں ایک داعی حق کی احتیاط صرف اس حد تک ہونی چاہیے کہ وقت کے مقبول اور رائج طریقوں میں سے وہ ان طریقوں کو نہ اختیار کرے جن میں کوئی پہلو اخلاق کے منافی ہو۔ اور اگر اس طرح کا کوئی طریقہ کسی خاص ضرورت سے اختیار ہی کرنا پڑ جائے تو اس کو اس اخلاقی برائی سے پاک کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل اول اول اپنی قوم کو غفلت سے بیدار کرنے اور اپنی بات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوہ صفا پر چڑھ کر جو نعرہ لگایا اس کی اصلی شکل عرب جاہلیت میں یہ تھی کہ خطرہ کی شدت کا اظہار کرنے کے لیے نعرہ لگانیوالا اپنے سارے کپڑے اتار کر بالکل ننگا ہو جاتا تھا، چنانچہ عربی میں اس کو "النذیر العریان" کہتے بھی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو چوکنا کرنے کا طریقہ تو وہی اختیار فرمایا جو ایک نذیر عریان کا ہوتا تھا لیکن عریاں ہونا چونکہ ایک سخت قسم کی بے حیائی اور بد اخلاقی تھی اس وجہ سے آپ نے اس برائی سے اس طریقہ کو پاک کر لیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو مجلسی اور اجتماعی طریقے پیدا ہو چکے ہیں ان میں اگر کوئی پہلو برائی کا ہے تو اس برائی کی وجہ سے ان کو یکقلم رد کر دینا کچھ ضروری نہیں ہے بلکہ کرنا یہ چاہیے کہ ان طریقوں کو برائیوں سے پاک کر کے ان کو مقصد حق میں استعمال کیا جائے۔

آج متمدن ملکوں میں کسی فکر کو لوگوں کے اندر پھیلانے کے جو بے شمار طریقے پیدا ہو چکے ہیں وہ جس طرح برائیوں کو پھیلانے میں کارآمد ہیں اسی طرح بھلائیوں کے پھیلانے میں بھی نہایت کارآمد ہو سکتے ہیں ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ برائیوں سے بچ کر ان سے فائدہ اٹھایا جائے لیکن مشکل یہ ہے کہ آج جو لوگ ان کو اختیار کرتے ہیں وہ یا تو ان کو ان کی تمام موجودہ خصوصیات کے ساتھ اختیار کرتے ہیں خواہ کسی مقصد حق ہی کے لیے استعمال کریں یا اس خیال سے سرے سے ان کو ہاتھ ہی نہیں لگانا چاہتے کہ ان میں بعض پہلو برائی کے بھی ہیں۔

یہ وہ اصولی ہدایتیں ان طریقوں سے متعلق لحاظ رکھنے کی ہیں جو ایک داعی حق کو اپنی دعوت کے سلسلہ میں اختیار کرنے ہیں۔ اب بعض ہدایتیں ان طریقوں سے متعلق ہم ذکر کرینگے جن سے بہرحال ایک داعی حق کو احتراز کرنا ہے۔

اس سلسلہ میں اصولی بات یہ ہے کہ داعی کو کوئی ایسا طریقہ نہیں اختیار کرنا چاہیے جو دعوت یا داعی کے وقار یا مفاد کے خلاف ہو۔ ایسی باتیں جو دعوت یا داعی کے وقار یا مفاد کے خلاف ہوں بہت سی ہوسکتی ہیں۔ ان سب کو گننا مشکل ہوگا۔ صرف بعض باتیں ہم بطور مثال ذکر کریں گے جن سے فی الجملہ اندازہ ہوسکے کہ داعیان حق کو کس قسم کے طریقوں سے بچنا چاہیے۔

الف۔ ایک داعی حق کو استمالت کے ان تمام طریقوں سے بچنا چاہیے جن سے دعوت کی شان یا خود داعی کے وقار کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اپنے کام میں غیر معمولی انہماک اور لوگوں کو حق کی طرف کھینچنے کی زیادہ سے زیادہ خواہش ایک داعی کی بہترین خصوصیت ہے لیکن اس انہماک اور اس خواہش کو اس حد تک نہیں بڑھنا چاہیے کہ داعی کو نہ اپنے نفس کے حقوق کا کچھ ہوش رہے، نہ اپنے ساتھیوں اور دوستوں کا کچھ خیال رہے، اور نہ اپنی دعوت کے مرتبہ اور مقام ہی کی کچھ پرواہ رہ جائے۔ جو سننا نہیں چاہتے ان کو سنانے کے درپے ہونا، بھاگنے والوں کے پیچھے پڑنا، نفرت کرنے والوں کو پرچانا اور گھمنڈ کرنے والوں کی تواضع کرنا بس وہیں تک جائز ہے کہ داعی کی خودداری اور دعوت کی عظمت کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور دعوت کے کام میں کوئی پہلو ابتذال کا نہ پیدا ہونے پائے۔ اگر معاملہ اس حد سے آگے بڑھتا نظر آئے تو جس حق کی محبت داعی کو اس حد تک جھکنے پر مجبور کر رہی ہے اسی حق کے احترام کا تقاضا ہے کہ وہ پوری خودداری کے ساتھ ایسے لوگوں سے الگ ہو جائے اور صرف ان لوگوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے جن میں حق کی طلب اور علم کی پیاس موجود ہے۔ سورہ عبس کی مندرجہ ذیل آیتوں میں آنحضرت صلعم کو متکبرین کی اسی طرح کی استمالت سے روکا گیا ہے اور اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس بلند رتبہ دعوت کو لے کر تم اٹھے ہو وہ ایسی نہیں ہے کہ اس کو اس قدر جھک کر پیش کیا جائے۔ ان آیات میں قرآن کی عظمت اور اس کے مرتبہ کی بلندی کا ذکر اسی پہلو سے ہے۔

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی
وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی وَاَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی
وَھُوَ یَخْشٰی فَاَنْتَ عَنْہُ تَلَھّٰی کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ

لیکن جو بے پروائی برتتا ہے تو تم اس کے پیچھے پڑتے ہو حالانکہ
تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے اگر وہ اپنے آپ کو نہ سدھارے
اور وہ جو تمہارے پاس شوق سے آتا ہے اور اپنے خدا

فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ (۵ - ۱۶ عبس)

ہرگز نہیں یہ تو بس ایک یاد دہانی ہے سو جو شخص چاہے اس سے فائدہ اٹھائے معزز، بلند رتبہ اور پاکیزہ صحیفوں میں، گرامی قدر اور باوفا منشیوں کے ہاتھ ہیں سے ڈرتا بھی ہے تو تم اس سے بے پروائی برتتے ہو۔

تبلیغ کے جوش میں یہ بات جائز نہیں ہے کہ آدمی جس مجلس میں چاہے جا دھمکے اور کوئی متوجہ ہو یا نہ ہو لیکن وہ اپنی بات سنائے بغیر نہ ٹلے یا چمٹنے والے گداگروں کی طرح جو راہ گیر لِ جائے اس کے پیچھے پڑ جائے اور جب تک اس کو سنا نہ لے یا اس سے کچھ سن نہ لے اس وقت تک اس کا پیچھا نہ چھوڑے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ:

ولا الفينك تاتي القوم وهم في حديث من حديثهم فتقص عليهم ولكن انصت فاذا امروك فحدثهم وهم يشتهونه (بخاری)

میں تمھیں اس حال میں نہ دیکھوں کہ تم کسی قوم کے پاس جاؤ اور وہ اپنے کسی اور کام میں ہوں اور اسی حال میں تم ان کو سنانا شروع کر دو بلکہ خاموش رہو اور جب وہ فرمائش کریں تو ان کو سناؤ اور وہ خواہش سے سنیں۔

کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنے سے سخت احتراز کرنا چاہیے جس سے دعوت لوگوں پر بوجھ بن جائے اور وہ اس سے گھبرانے لگ جائیں۔

عن شقيق قال كان عبد الله بن مسعود يذكر الناس في كل خميس فقال له رجل يا ابا عبد الرحمٰن لوددت انك ذكرتنا في كل يوم قال اما انه يمنعني من ذلك اني اكره ان املكم واني اتخولكم بالموعظة كما كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يتخولنا بها مخافة السامة علينا

شقیق سے روایت ہے کہ عبد اللہ بن مسعود لوگوں کو ہر جمعرات کو وعظ سنایا کرتے تھے ایک شخص نے ان سے کہا اے ابو عبد الرحمٰن میری خواہش ہے کہ آپ روزانہ وعظ کہا کریں۔ انھوں نے کہا میں ایسا اس وجہ سے نہیں کرتا کہ کہیں تم پر بوجھ نہ بن جاؤں۔ میں بھی اسی طرح ناغہ کر کے تمھیں نصیحت سناتا ہوں جس طرح آنحضرت صلعم ہم کو ناغہ کر کے نصیحت سنایا کرتے تھے کہ ہم بیزار نہ ہو جائیں۔

ب۔ داعی حق کو کبھی کوئی ایسا طریقہ نہیں اختیار کرنا چاہیے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے دعوت

منفسدکے بالکل منافی ہو مثلاً مناظرہ کا طریقہ۔ یہ طریقہ اگرچہ ایک مدت سے دعوت و تبلیغ کا سب سے زیادہ موثر طریقہ خیال کیا جاتا ہے، اور اس کی اسی اہمیت کی وجہ سے ہمارے اہل فن نے اس پر کتابیں بھی لکھ ڈالی ہیں جو ہمارے عربی مدرسوں میں پڑھائی بھی جاتی ہیں لیکن دعوت حق کی روح سے جس قدر بعید یہ طریقہ ہے اس قدر بعید کوئی اور طریقہ ہو نہیں سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مجادلہ اور محاجہ کی اجازت دی ہے لیکن ان لفظوں کا مفہوم یہ مناظرہ سمجھ لینا جس کی تعلیم ہماری دینی درسگاہوں میں دی جاتی ہے اور جس کے اکھاڑے آئے دن ہمارے مبلغین اور مناظرین جماتے رہتے ہیں، بالکل غلط ہے۔ چونکہ ہمارے اہل مناظرہ کا زیادہ تر استدلال قرآن مجید کے انہی دو لفظوں سے ہے اس وجہ سے ہم مختصراً ان دونوں لفظوں کا مفہوم قرآن سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ انبیا کے مجادلہ اور محاجہ اور مروجہ مناظرہ کا فرق واضح ہو سکے۔

قرآن شریف میں دو طرح کے مجادلہ کا ذکر آتا ہے، ایک مجادلہ باطل، دوسرا مجادلہ حسن۔ مجادلہ باطل کو قرآن نے کفار اور معاندین کی طرف منسوب کیا ہے اور اس کی خصوصیات تقریباً وہی بیان کی ہیں جو عام طور پر اس زمانہ کے مناظروں میں پائی جاتی ہیں۔ وہی اپنی بات پر بلا کسی دلیل معقول کے اصرار، وہی غیر متعلق باتوں پر گرفت، وہی بے فائدہ کج بحثیوں میں تضیع وقت، وہی اپنے حریف کی بات کو نہ خود سننا نہ کسی کو سننے دینا، وہی لاطائل موشگافیاں اور بے نتیجہ زبان درازیاں جو عام طور پر اس زمانہ کے مناظرات کی خصوصیات میں شامل ہیں وہی قرآن نے مجادلہ باطل کی خصوصیات بھی بتائی ہیں اور اہل حق کو نہایت سختی کے ساتھ ان سے روکا ہے اور صرف احسن طریقہ سے مجادلہ کی اجازت دی ہے اور اس احسن طریقہ کی وضاحت علمی اور عملی دونوں پہلوؤں سے خود کر دی ہے تاکہ اس کو ہر شخص اچھی طرح سمجھ جائے۔

اس کا علمی طریقہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ مخاطب سے لڑائی کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کی جائے کہ جن اصولوں میں اس کے ساتھ اشتراک و اتحاد ہے اس مشترک پہلو کو اس کے سامنے واضح کیا جائے تاکہ وہ داعی کی بات سننے کی طرف راغب ہو اور پھر اس کے سامنے ان نتائج کو رکھا جائے جو اس کے اپنے اقرار کردہ اصول سے لازمی طور پر نکلتے ہیں تاکہ وہ ان کو اپنی بات سمجھ کر قبول

کرنے کی طرف مائل ہو۔ مثلاً فرمایا:

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۴۶ ۔ عنکبوت)

اور نہ مناظرہ کرو اہل کتاب سے مگر اس طریق سے جو بہتر ہے اور جنھوں نے ان میں سے اپنے اوپر ظلم کیا ہے ان کو تو سرے سے منہ ہی نہ لگاؤ اور کہو کہ ہم ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو ہماری طرف اتاری گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمھاری طرف اتاری گئی ہے اور ہمارا تمھارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

اسی اصول کے اہتمام میں اہل کتاب کے سامنے توحید کی دعوت ایسے الفاظ میں پیش کی گئی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ جب اہل ایمان اور اہل کتاب میں بحیثیت اصول کے یہ چیز یکساں طور پر مسلّم ہے تو پھر اس کے نتائج اور مقتضیات میں باہم کوئی اختلاف کیوں ہو!

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـــًٔـا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (۶۴ ۔ آل عمران)

کہہ دو اے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان مسلّم ہے وہ یہ کہ ہم نہ بندگی کریں مگر اللہ کی اور نہ بنائیں کسی چیز کو اس کا ساجھی اور نہ بنائے ہم میں سے کوئی کسی کو رب اللہ کے سوا۔ پس اگر وہ اس کے مقتضیات سے اعراض کریں تو اعلان کر دو کہ گواہ رہو کہ ہم اللہ ہی کے فرمانبردار ہیں۔

قرآن نے مجادلہ کی عملی مثالیں جو نقل کی ہیں اور جن کی تعریف فرمائی ہے ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مجادلہ درحقیقت نام ہے اس بات کا کہ اپنی بات منوانے کے لیے، مخاطب پر محبت، اعتماد، حسن اخلاق اور حسن استدلال سے گھیرے ڈالے جائیں یہاں تک کہ وہ داعی کی دل سوزی، اس کی بے لوثی اور اس کے اخلاص سے متاثر ہو کر اس کی بات کی صداقت پر غور کرنے اور اس کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ قرآن نے اس طرح کے متعدد مجادلے نقل کیے ہیں جن کی تفصیل میں طوالت ہے۔ ہم صرف ایک مجادلہ بطور مثال ذکر کریں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ کس طرح کے پر محبت اصرار و اظہار کو مجادلہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور اس کی تعریف کی گئی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم لوط کے بارہ میں اللہ تعالےٰ

ے جو مجادلہ کیا ہے قرآن نے اس کی تعریف فرمائی ہے کہ یہ مجادلہ ان کی دردمندی اور دل سوزی کا نتیجہ تھا۔
اس مجادلہ کی تفصیل تورات میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

تب ابرہام نے نزدیک جاکر کہا کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا؟ شاید اس شہر میں پچاس راستباز ہوں۔ کیا تو اسے ہلاک کرے گا اور ان پچاس راستبازوں کی خاطر جو اس میں ہوں اس مقام کو نہ چھوڑے گا؟ ایسا کرنا تجھ سے بعید ہے کہ نیک کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک بد کے برابر ہو جائیں۔ یہ تجھ سے بعید ہے۔ کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا؟ اور خداوند نے فرمایا کہ اگر مجھے سدوم میں شہر کے اندر پچاس راستباز ملیں تو میں ان کی خاطر اس مقام کو چھوڑ دوں گا۔ تب ابرہام نے جواب دیا اور کہا کہ دیکھیے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں۔ شاید پچاس راستبازوں میں پانچ کم ہوں کیا ان پانچ کی کمی کے سبب سے تو تمام شہر کو نیست کرے گا اس نے کہا اگر مجھے وہاں پینتالیس ملیں تو میں اسے نیست نہیں کروں گا۔ پھر اس نے اس سے کہا شاید وہاں چالیس ہیں تب اس نے کہا میں ان چالیس کی خاطر بھی یہ نہیں کروں گا۔ اس نے کہا اگر مجھے وہاں تیس بھی ملیں تو بھی میں ایسا نہیں کروں گا۔ پھر اس نے کہا دیکھیے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی۔ شاید وہاں بیس ملیں۔ اس نے کہا میں اسے بیس کی خاطر بھی نیست نہیں کروں گا۔ تب اس نے کہا اگر خداوند ناراض نہ ہو تو میں ایک بار اور کچھ عرض کروں۔ شاید وہاں دس ملیں اس نے کہا میں دس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔ جب خداوند ابرہام سے باتیں کر چکا تو چلا گیا اور ابرہام اپنے مکان کو لوٹا۔" (پیدائش باب ۱۸: ۲۳-۳۳)

اس طرز کلام، اس طرز تخاطب اور اس طرز استدلال و اصرار کو قرآن نے مجادلہ سے تعبیر کیا ہے اور اس مجادلہ کی تعریف فرمائی ہے۔ اگر لوگ انہی مجادلوں کو اپنے مناظروں کے جواز کی دلیل قرار دیتے ہیں تو چاہیے کہ جو روح اس مجادلہ کے اندر ہے وہی روح اپنے مناظروں کے اندر پیدا کریں اور اسی لطف و محبت اور دل سوزی و دردمندی کے ساتھ اپنی بات مخاطب کے سامنے پیش کریں نہ کہ سارا اہتمام رزم و پیکار اور جنگ و قتال کا ہو اور اس کا نام رکھ لیا جائے مناظرہ اور اس کے جواز کی دلیل لائی جائے انبیاء کی زندگی سے

اسی طرح قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک محاجہ بھی نقل فرمایا ہے جو ایک بادشاہ اور ان کے درمیان ہوا ہے اس محاجہ کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ "میرا رب وہ ہے جو مارتا اور جلاتا ہے" اس کے جواب میں بادشاہ نے کہا کہ "میں مارتا اور جلاتا ہوں" اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ "میرا پروردگار سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اس کو مغرب سے نکال"۔ اس مناظرہ کو اگر مناظرہ کے اصولوں پر پرکھا جائے جن کی تعلیم ہماری مناظرہ کی کتابوں میں دی جاتی ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کچھ اچھے مناظر ثابت نہ ہوں گے کیونکہ وہ بادشاہ کے اس قول پر کہ "میں مارتا ہوں اور جلاتا ہوں" بہت کچھ معارضہ کر سکتے تھے جو انھوں نے نہیں کیا بلکہ جونہی ان کے سامنے یہ حقیقت آئی کہ یہ شخص مناظرہ اور پنی بات کی پچ کرنے پر تل گیا ہے وہ ایک مسکت بات کہکر فوراً علیحدہ ہوگئے جس سے فی الجملہ اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اگر داعی حق کو مخاطب کے متعلق یہ اندازہ ہو جائے کہ یہ بات کو سننا اور سمجھنا نہیں چاہتا بلکہ معارضہ اور مناظرہ پر اتر آیا ہے تو اس کے منانے کے درپے نہیں ہونا چاہیے بلکہ گفتگو کو ختم کر دینا چاہیے۔

ایک ضروری معذرت

اس پرچہ میں "زکوٰۃ" والے مضمون کی قسط نہیں پیش کی جا رہی ہے۔ مجبوری یہ ہے کہ اعداد و شمار کے متعلق جن کتابوں کی ضرورت تھی، وہ خلاف توقع بروقت نہیں مل سکیں۔ ضروری کتابوں کے مہیا ہو جاتے ہی اس سلسلہ کو مکمل کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

(نعیم صدیقی)